دیباچہ اسرارِ خودی

ڈاکٹر رینالڈ اے نکلسن

اسرارِ خودی پہلی بار ۱۹۱۵ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ انھیں دنوں جب میں نے اسے پڑھا تو مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے اس کے انگریزی ترجمے کے لیے اقبال سے اجازت چاہی۔ مجھے پندرہ سال قبل کیمبرج میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ میری تجویز بخوشی قبول کر لی گئی لیکن اسی دوران میں کچھ اور مصروفیات میں الجھ گیا جن کی وجہ سے ترجمے کا کام پچھلے سال تک مؤخر رہا۔ اس سے قبل کہ ترجمہ قارئین کی نظر سے گزرے اس نظم اور مصنف کے بارے میں چند کلمات تحریر کرنا ضروری ہیں۔

اقبال ایک ہندی مسلمان ہے۔ مغرب میں اپنے قیام کے دوران اس نے جدید فلسفہ پڑھا اور اسی مضمون میں اس نے کیمبرج اور میونخ یونیورسٹی سے اعلیٰ ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ ایرانی فلسفہ ما بعد الطبیعات کا ارتقا جو ایک بلند پایہ مقالہ اور اقبال کے تجزیاتی مطالعے کا نتیجہ ہے، ۱۹۰۸ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس وقت سے فلسفہ میں اقبال نے ایک خاص اندازِ نظر اپنایا ہے جس کے بارے میں چند ایک انتہائی دلچسپ اشارے یہاں درج کروں گا جو خود اقبال نے مجھے لکھے ہیں اگرچہ اسرار خودی میں ان کا فلسفہ کسی خاص منظّم اور مربوط انداز کا حامل نہیں تاہم یہ کتاب ان کے نظریات کو بڑے دلکش اور دل پذیر روپ میں پیش کرتی ہے جہاں ہندو مفکرین نے ویدانت کے اصول کی تشریح کرتے ہوئے ذہن پر زور دیا ہے وہاں اقبال نے فارسی شعرا کی طرح جو اسی اصول کے مبلغ ہیں زیادہ خار دار راستہ اپنایا ہے اور انسانی قلب کو اپنا مرجع بنایا ہے۔ وہ کوئی معمولی قسم کا شاعر نہیں بلکہ جہاں اس کی منطق کارگر نہیں ہوتی وہاں اس کے اشعار دلوں میں انگیخت اور ترغیب پیدا کر دیتے ہیں اس کا پیغام صرف ہندی مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ہے اس وجہ سے اس نے ہندوستانی (اردو) کی بجائے فارسی زبان اختیار کی ہے کیونکہ پڑھے لکھے مسلمانوں میں بیشتر فارسی زبان سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ یہ فارسی ہی کا طرہ امتیاز ہے کہ وہ فلسفیانہ نظریات کے اظہار کے لیے ایک ایسا اسلوب فراہم کرتی

ہے جو کبھی بڑا دلپذیر اور ارفع خیال کیا جاتا تھا۔

اقبال ایک مصلح اور داعی کی حیثیت سے ابھرا ہے اگر موجودہ دور سے نہیں تو کم از کم آیندہ نسلوں سے وہ اپنا لوہا ضرور منوائے گا:

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم   من نوائے شاعر فرداستم

وہ فارسی انداز کے مطابق ساقی سے التجا کرتا ہے کہ وہ اس کا پیالہ شراب ناب سے بھر دے اور اس کے فکر کی شب تاریک میں چاندنی کی شعاعیں بکھر دے:

تا سوئے منزل کشم آوارۂ
ذوق بے تابی دہم نظارۂ
گرم رو از جستجوئے نو شوم
روشناسِ آرزوئے نو شوم

آیئے بالآخر اصل کتاب کے بارے کچھ کہیں، وہ کون سی منزل ہے جس کی طرف اقبال کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں اس سوال کے جواب سے ان کا اصل زاویہ نگاہ سامنے آئے گا نیز اس راستے پر گامزن ہو کر اس کی منزل کی نشاندہی کر سکیں گے۔ اقبال نے یورپی ادبیات کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ اس کا فلسفہ بڑی حد تک نیٹشے اور برگسان کا مرہون منت ہے اور اس کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں اکثر شیلے یاد آتا ہے۔ تاہم اقبال ایک مسلمان کی سوچ اور محسوسات رکھتا ہے اور ممکن ہے اسی سبب سے وہ گہرے اثرات مرتسم کر لے۔ وہ ایک پر جوش مذہبی مبلغ ہے جو جدید دارالحرم کے ایسے تصور سے تحریک حاصل کرتا ہے کہ مذہب کی بنیاد پر عالمی سطح پر امت مسلمہ کی تصوری ریاست پر مبنی ہو جہاں تمام مسلمان ملکی اور نسلی امتیازات سے ماورا ہو کر ملت واحد میں ضم ہو جائیں۔ اس کے نزدیک نیشنلزم اور سامراجیت کی کچھ اہمیت نہیں۔ اس کے خیال میں یہ تصورات ہمیں آزادی سے محروم کر دیتے ہیں اور ہماری حقیقی خوشیاں چھین لیتے ہیں۔ بنی نوع انسان کو ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنا دیتے ہیں۔ اخوت کے جذبات کے قاتل ہیں اور جنگ و جدل کے زہریلے بیج بوتے ہیں۔ وہ ایسی دنیا کا خواب دیکھتا ہے جہاں سیاست کی بجائے مذہب کی حکمرانی ہو، وہ میکاولی کی مذمت کرتا ہے جو اس کے خیال میں ''جھوٹے دیوتاؤں کا پجاری ہے'' اور جس کی تعلیم نے بہت سے لوگوں کو اندھا کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ اقبال جب بھی مذہب کی بات کرتا ہے تو اس کی مراد ہمیشہ اسلام سے ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک غیر مسلم کافر ہیں اور (نظریاتی سطح پر بہر طور) جہاد درست ہے بشرطیکہ وہ صرف اور صرف خدا کی رضا کے لیے جائے۔ اقبال کا آئیڈیل ایک ایسی آزاد اور خود مختار مسلم برادری ہے جس کا مرکز کعبہ ہو اور جو خدا کی محبت اور حب رسول کے جذبات باہمی کے رشتوں میں منسلک

ہو۔ اسرار خودی اور رموز بے خودی میں وہ اپنے اس تصور کی تبلیغ بڑے سوز و گداز سے کرتا ہے جو بہرحال قابلِ تحسین ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس مقصد کے حصول کے ذرائع بھی واضح کرتا ہے۔ اول الذکر مثنوی ایک مسلمان کی انفرادی زندگی سے متعلق اور موخر الذکر اسلام کی ہئیت اجتماعیہ کا نقشہ پیش کرتی ہے۔

قرآن اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف مراجعت کا آوازہ پہلے بھی سنائی دیتا رہا ہے تاہم ابھی تک اس پر کم ہی لوگوں نے کان دھرا ہے اور اس کا جواب زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہا۔ اب یہ آوازہ مغربی فلسفے کی قوت سے بھی ہم آہنگ ہے اور اسی بنا پر اقبال کو امید ہے اور وہ یقین واثق رکھتا ہے کہ یہ (مغربی فلسفہ) اس کی تحریک میں روح پھونک دے گا اور یقینی طور پر اس کو کامیاب بنائے گا۔ وہ دیکھتا ہے کہ ہندو دانشوروں اور وحدت الوجودی مسلمانوں نے وہ قوتِ عمل جو سائنسی مشاہدے اور مظاہرے فطرت کی توجیہات پر مبنی ہے اور جو مغربی اقوام، خاص کر انگریزوں کو ممتاز کرتی ہے، مشرقی لوگوں نے مسخ کر کے رکھ دی ہے اور اب اس صلاحیت کا انحصار اور احیا صرف اس تصور سے ممکن ہے کہ خودی کا وجود حقیقی ہے اور یہ صرف ذہنی التباس ہی کا نام نہیں۔ لہٰذا اقبال پورے زور سے فطری فلاسفروں اور نام نہاد صوفی شعراء، ادیبوں اور مصنفوں کی مخالفت کرتا ہے بلکہ اس کے خیال میں اسلام کے موجودہ انحطاط کا سبب بھی یہی لوگ ہیں۔ وہ دلائل و براہین سے یہ بات ثابت کرتا ہے کہ صرف اثبات ذاتِ خودنمائی اور استحکام خودی سے ہی مسلمان اپنی قوت اور آزادی کا احیا کر سکتے ہیں۔ وہ حافظ کی لوریاں دے کر سلانے والی تعلیمات کے مقابلے میں جلال الدین رومی کی ولولہ انگیز اخلاقی تعلیمات کو اختیار کرنے اور افلاطونی افکار سے ملمع شدہ اسلام کی بجائے حقیقی اور توحیدی جوش سے لبریز اسلام کا احیا چاہتا ہے کہ جس نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں قوتِ عمل کی روح پھونک دی تھی اور جس کے سبب اسلام کا وجود مجسم ہوا تھا۔ یہاں میں ایک ممکنہ غلط فہمی دور کرتا چلوں۔ اقبال کا فلسفہ دینی ہے لیکن وہ فلسفے کو مذہب کا غلام خیال نہیں کرتا اور اس بات پر یقین رکھتے ہوئے کہ فرد کی تکمیل ہی پر معاشرے کا وجود قائم ہے۔ اس کے نزدیک پیغمبر اسلام کا دیا ہوا اسلامی معاشرے کا تصور ہی ایک مثالی تصور ہے۔ ہر وہ مسلمان جو خود کو مردِ کامل کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے کوشاں ہے روئے ارضی پر خلافتِ الٰہیہ کے قیام میں معاون ہے۔

اسرار خودی مشہور مثنوی مولانا روم کی بحر اور اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ تمہید میں اقبال لکھتے ہیں کہ جلال الدین رومی (جس سے ان کا وہی تعلق ہے جو ورجل کا دانتے سے تھا) ہیولے کی صورت میں ان کے سامنے نمودار ہوئے اور انھیں نغمہ الاپنے کی ترغیب دی۔ اقبال جہاں حافظ کی طرز کے تصوف کا شدید مخالف ہے وہاں وہ جلال الدین رومی کی مصفا اور عمیق بصیرت کو خراج تحسین پیش کرتا ہے تاہم وہ اس عظیم فارسی صوفی کے بتائے ہوئے خودسپردگی کے اصول کو بھی رد کرتا ہے اور وحدت الوجودی پروازوں میں اس کا

شریک سفر بھی بننا پسند نہیں کرتا۔

اسرار خودی کے مطالعہ میں یورپی قارئین کو بعض مشکلات ضرورت پیش آئیں گی جنھیں کوئی بھی ترجمہ دور کرنے سے قاصر ہے۔ ان میں سے کچھ اس کی ہیئت سے متعلق ہیں جنھیں فارسی نظم سے شناسا کوئی بھی شخص زیادہ محسوس نہیں کرے گا تاہم ان میں سے کچھ کا تعلق ان نظریات اور مخصوص مشرقی اندازِ فکر سے ہے جن کو سمجھنے میں ہمیں خاصی دشواری محسوس ہوتی ہے۔ میں وثوق سے یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ میں ہر شعر کے مفہوم کی تہ تک پہنچا ہوں، یا میں نے اسے بالکل صحیح سمجھا ہے۔ پھر بھی مجھے امید ہے کہ ایسی غلطیاں بہت کم ہوں گی، اس کے لیے میں اپنے دوست محمد شفیع کا شکر گزار ہوں جن کی مدد سے میں نے اس مثنوی کو پڑھا اور مشکل مقامات پر ان کی رہنمائی حاصل کی، کچھ دوسرے بنیادی مسائل خود مصنف نے میرے لیے آسان کر دیئے ہیں۔ میری درخواست پر انھوں نے کتاب میں شامل اور زیر حوالہ اپنے فلسفیانہ خیالات کے بارے میں ایک بیان تحریر فرمایا۔ میں اسے ان کے الفاظ میں پیش کر رہا ہوں۔ اگرچہ یہ بیان جامع نہیں اور جیسا کہ وہ کہتے ہیں ''یہ بہت عجلت میں لکھا گیا ہے'' لیکن زورِ بیان اور جدت ادا کے علاوہ اس میں انھوں نے اپنی شاعرانہ توجیہات کو میری ہر ممکن وضاحت سے بھی زیادہ شرح وبسط سے پیش کر دیا ہے۔

اسرار خودی کے فلسفیانہ مبادیات [اقبال]

''یہ تجربہ محدود مراکز میں وقوع پذیر ہونا چاہیے تاہم یہ عارضی اور محدود وقوع پذیری بالآخر نا قابل توجیہہ ٹھہرے گی''۔ یہ ہیں پروفیسر بریڈلے کے الفاظ، لیکن ان کا نا قابل توجیہہ مراکز سے آغاز کرتے ہوئے وہ انھیں ایک وحدت میں ضم کرتا ہے جسے وہ وجود مطلق کا نام دیتا ہے اور جہاں پہنچ کر ان محدود مراکز کی محدودیت اور انفرادیت ختم ہو جاتی ہے لہٰذا ان کے بقول محدود مرکز صرف علامت یا شبیہ ہے۔ ان کی رائے میں حقیقت کی پہچان نا قابل توجیہہ ہے اور چونکہ تمام حدود اضافیت سے متاثر ہیں لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ مؤخر الذکر صرف التباس ہے۔ میرے خیال میں نا قابل توجیہہ محدود مرکز کا یہ تجربہ کائنات کی بنیادی حقیقت ہے، زندگی انفرادیت سے قائم ہے۔ کائناتی زندگی کے مقابلے میں کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں۔ خدا بھی ایک منفرد ہستی ہے بلکہ منفرد ترین ہستی کا نام ہے اور کائنات بھی جیسا کہ ڈاکٹر میکٹیگرٹ کہتے ہیں ''افراد (Individual) کی تنظیم کا نام ہے''۔ لیکن ہم اتنا اضافہ کر سکتے ہیں کہ یہ اتحاد اور نظم جو ہمیں اس وحدت میں نظر آتا ہے، نہ تو دوامی ہے اور نہ مکمل ہی، یہ صرف جبلی اور شعوری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہم تدریجاً بے ترتیبی اور بدنظمی سے تنظیم و تکمیل کی طرف رواں دواں اور اُس منزل کے حصول میں معاون ہیں نہ کہ ہم کسی جامد تنظیم کے رکن ہیں۔ نئے ارکان کا مسلسل ظہور ہو رہا ہے جو اس کارِ عظیم میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں لہٰذا

کائنات کوئی تکمیل شدہ فعل نہیں بلکہ ابھی نا تمام اور تکمیل کے مراحل میں ہے لہٰذا کائنات کے بارے میں کوئی بھی صداقت حتمی نہیں کہلا سکتی کیونکہ کائنات بذات خود ابھی تک ایک ''کل'' نہیں بن سکی۔ تخلیقی کا عمل ابھی جاری ہے اور انسان بھی اس میں اپنا فریضہ ادا کر رہا ہے۔ اور کسی حد تک اس بد نظمی کی کیفیت کو ایک تنظیم اور وحدت میں بدل رہا ہے۔ قرآن کی رو سے خدا کے علاوہ دیگر خالقین کے وجود کا امکان بھی ظاہر ہے۔

انسان اور کائنات کے بارے میں یہ تصور بظاہر نیو ہیگلین نیز ہر قسم کے وحدت الوجودی تصوف کا مخالف ہے جو کائناتی زندگی یا روح الاعظم میں فنا ہونے کو ہی انسان کا قطعی مطمح نظر اور نجات تصور کرتے ہیں ۔ انسان کا مذہبی اور اخلاقی آئیڈیل نفی خودی کی بجائے اثبات ذات ہے اور وہ اس آئیڈیل کو اپنی انفرادی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ابھار کر اور منفرد بن کر ہی کر سکتا ہے، رسول کریمؐ کا ارشاد ہے تخلقوا باخلاق اللّٰہ آپ اپنے میں خدائی صفات پیدا کرو گویا منفرد ترین ہستی کی صفات کو زیادہ سے زیادہ اپنا کر ہی انسان منفرد بن سکتا ہے۔ پھر زندگی کیا ہے؟ یہ انفرادیت کا دوسرا نام ہے بلکہ اس کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ جہاں تک خودی کا تعلق ہے کہ جس سے ایک فرد کلیتاً خود کفیل مرکز بن جاتا ہے کیونکہ روحانی اور طبعی طور پر انسان ایک خود کفیل مرکز ہے لیکن وہ ابھی تک مکمل طور پر انفرادیت کا حامل نہیں جس قدر خدا سے اُس کا بُعد زیادہ ہوگا اتنی ہی اس میں کم انفرادیت آئے گی اور جس کو جتنا زیادہ قربِ الٰہی حاصل ہوگا اتنا ہی وہ کامل ترین انسان کہلائے گا۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ بالآخر فنا فی اللہ ہو جائے گا بلکہ اس کے برعکس وہ خدا کو خود میں جذب کرے گا۔

حقیقی انسان، تسخیر جہات سے نہ صرف آفاق کو خود میں گم کر لیتا ہے بلکہ وہ خدا کو بھی اپنی خودی میں جذب کر لیتا ہے۔ زندگی ایک جاذب اور ارتقا پذیر تحریک کا نام ہے اس کا جوہر یہ ہے کہ آرزوئیں اور خواہشات مسلسل تخلیق ہوتی رہیں اور پھر ان کے تحفظ اور وسعت کے لیے زندگی نے اپنے آپ سے بعض صلاحیتیں ایجاد کیں اور بعض ذرائع اپنائے ہیں، یعنی حواس اور عقل وغیرہ جو رکاوٹوں کو جذب کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ زندگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ اور فطرت ہے۔ تاہم فطرت شر سے عبارت نہیں۔ کیونکہ یہ زندگی کی داخلی قوتوں کو روبہ عمل ہونے کے قابل بناتی ہے۔ خودی اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں کی تسخیر سے آزادی حاصل کرتی ہے، یہ جزوی طور پر آزاد ہے اور جزوی طور پر پابند اور کسی بے نیاز ذات خدا سے تعلق پیدا کر کے ہی یہ کلی آزادی حاصل کر سکتی ہے، مختصراً زندگی کاوشِ آزادی کا نام ہے۔

خودی اور تسلسل شخصیت

کسی انسان کے پیکرِ ہستی کا مرکز اس کی خودی ہے۔ شخصیت اضطراب سے عبارت ہے اور اس کا

تسلسل اس کیفیت کے وجود کا مرہون منت ہے۔ اگر یہ اضطرابی کیفیت برقرار نہ رہے تو شخصیت میں جھول آ جائے گا چونکہ شخصیت یا اضطرابی کیفیت انسان کی گراں قدر کامیابی ہے لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ اس کیفیت کی بجائے سستی اور کسالت کو جگہ نہ لینے دے، وہ چیز جو ہمیں اضطرابی کیفیت کو برقرار رکھنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ہمیں دوام بخشنا چاہتی ہے۔ اس طرح شخصیت کا تصور ہمیں ''قدر'' کا معیار بھی عطا کرتا ہے اور خیر وشر کا مسئلہ بھی حل کر دیتا ہے۔ جس سے شخصیت مستحکم ہو خیر ہے اور جس سے کمزور ہو وہ شر ہے۔ آرٹ، مذہب اور علم الاخلاق بھی شخصیت کے نقطۂ نظر سے جانچے جانے چاہئیں۔ افلاطون پر میری تنقید کا ہدف وہ فلسفیانہ نظام ہیں جو حیات کی بجائے موت کو بطور آئیڈل اپنائے ہوئے ہیں، یعنی وہ نظام جو راہ حیات کی سب سے بڑی رکاوٹ یعنی مادہ کو نظر انداز کرتے ہیں اور اس کی تسخیر کی بجائے اس سے گریز سکھاتے ہیں۔

جس طرح آزادیٔ خودی کے سوال کے ضمن میں ہمیں مادہ اور اس کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح خودی کی ابدیت کے لیے ہمیں زمان کا مسئلہ درپیش ہے۔ برگساں ہمیں بتاتے ہیں کہ زمان کوئی پیکراں سمت (Line) نہیں (سمت کے مکانی تصور کے لحاظ سے) جس سے ہمیں اپنی پسند و ناپسند ہر صورت میں بہر طور گزرنا پڑتا ہے۔ زمان کا یہ تصور آمیزش شدہ ہے۔ زمان خالص طوالت نہیں رکھتا۔ انفرادی دوام تمنا کے زمرے میں آتی ہے۔ اگر کوئی اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے تو وہ اس کو حاصل کر سکتا ہے۔ اس کا انحصار زندگی کے بارے میں اس اندازِ نظر اور تصور پر مبنی ہے جس کے طفیل ہم اپنی اضطرابی کیفیت کو برقرار رکھتے ہیں۔ بدھ ازم، ایرانی تصوف اور اس سے مشابہ نظام اخلاق اس سلسلہ میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے تاہم انھیں کلیتاً بے سود بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ ایک طویل عرصے کی عظیم جدوجہد کے بعد ہمیں وقتی طور پر نشہ طاری کرنے والی چیزوں کی ضرورت سی محسوس ہوتی ہے۔ فکر وعمل کی یہ اقسام زندگی کے روز روشن میں شب تاریک کی حیثیت رکھتی ہیں لہٰذا اگر ہماری سرگرمیوں کا مقصود اضطرابی کیفیت کو برقرار رکھنا ہو تو موت کا صدمہ بھی خودی کو متاثر نہیں کر سکتا۔ موت کے بعد ممکن ہے ستانے کا کچھ وقفہ ہو جسے قرآن ''برزخ'' یا ''درمیانی حالت'' سے تعبیر کرتا ہے اور قیامت کے دن ہی ہوگا۔ ستانے کے اس وقفے کے بعد صرف وہ ارواح دوبارہ زندہ ہو سکیں گی جنھوں نے موجودہ زندگی بڑی احتیاط سے گذاری ہوگی۔ زندگی اگرچہ اپنے ارتقا میں اعادے سے گریز کرتی ہے تاہم برگساں کے اصولوں کے مطابق جیسا کہ وائلڈن کار کہتے ہیں جسم کا معاد بھی ممکن ہے۔ زمان کو آنات میں تقسیم کر کے ہم اسے مکانی روپ دیتے ہیں اور اس کی تسخیر میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ زمان کی خالص نوعیت کا احساس ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم اپنے دل کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرتے ہیں۔ زماں خالص ہی حقیقت میں زندگی ہے جو ایک خالص اضطرابی کیفیت (شخصیت) سے عبارت ہے اور جواب تک اس کی کامیابی ہے اور اسی کے استقراء

سے وہ خود کو محفوظ رکھتی ہے۔ ہم اس وقت تک پابند زمان ہیں جب تک ہم اسے مکانی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ زمان کا مکانی تصور ہی رکاوٹیں ہیں جو زندگی نے ماحول سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے لیے گھڑ لی ہیں۔ حقیقت میں وقت کی شکست و ریخت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور اسی قسم کی ابدی کیفیت کا احساس ہمیں اس زندگی میں بھی ہو سکتا ہے تاہم یہ الہامی کیفیت صرف لمحاتی ہوتی ہے۔

تربیت خودی

''خودی عشق'' سے مستحکم ہوتی ہے۔ یہ لفظ بڑے وسیع معنوں میں مستعمل ہے اور اس کے معنی جذب و انضمام کی خواہش کے ہیں۔ اس کی ارفع ترین صورت اقدار و تصورات کی تخلیق اور ان کے حصول کے لیے کوشاں رہنا ہے۔ عشق محبّ اور محبوب دونوں کو دوام بخشتا ہے۔ سب سے زیادہ منفرد خودی کے حصول کی کوشش طالب کو وہ مرتبہ عطا کرتی ہے اور مطلوب کے درجے تک لے جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر طالب کو کسی پہلو اطمینان نہیں ہوتا۔ جس طرح عشق سے خودی مستحکم ہوتی ہے اسی طرح ''سوال'' سے ضعیف ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ جو ذاتی کاوش کے بغیر حاصل کیا جاتا ہے ''سوال'' کے زمرے میں آتا ہے۔ کسی امیر کا بیٹا جو بہت بڑی دولت وراثت سے حاصل کرتا ہے سائل ہے۔ یہی حال اُس کا ہے جو دوسروں کے افکار کی خوشہ چینی کرتا ہے اور استحکام خودی کے لیے ہمیں عشق اختیار کرنا ہوگا۔ یعنی جذب و انضمام کی فعال قوت اور ہر قسم کے سوال اور بے عملی سے گریز کرنا ہوگا۔ عشق یعنی فعال انضمام کا سبق ہر مسلمان کو رسول کریمؐ کی زندگی سے ملتا ہے۔

نظم کے دوسرے حصے میں میں نے مسلمانوں کی اخلاقیات کے عام اصولوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور شخصیت کے توسط سے ان کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ خودی کو اپنی تکمیل تک پہنچانے کے لیے تین مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

اول: اطاعتِ شریعت۔

دوم: ضبطِ نفس، اپنے حقیقی مفہوم میں خود آگہی اور خودی مجسم ہے۔

سوم: نیابت اللہ۔

نیابت اللہ (خودی کا تیسرا مرحلہ) اور روئے زمین پر انسانی معراج ہے۔ نائب حق روئے ارضی پر خلیفہ فی الارض ہے اور مکمل ترین خودی کا مظہر ہے۔ وہ خودی کی تکمیل یافتہ تجسیم، معراجِ انسانیت اور جسم و دماغ کے لحاظ سے زندگی کا نقطۂ عروج ہے۔ اس کی صورت میں ہماری ذہنی ناموافقت بھی مطابقت میں ڈھل جاتی ہے۔ اس میں علم و قوت کی اعلیٰ ترین صلاحیتیں یکجا ہیں۔ اس کی زندگی میں فکر و عمل، عقل و جبلت

متحد ہیں۔ وہ شجرِ انسانیت کا آخری ثمر ہے اور مدارجِ ارتقا کی کرب ناک ابتلائیں بجا ہیں کیونکہ اس کے بعد ہی اسے آنا تھا۔ وہی انسانیت کا صحیح حکمران ہے اور اس کی سلطنت روئے ارضی پر خدائی سلطنت ہے، وہ اپنی بیکراں صلاحیتوں سے دوسروں پر فراخ دلی سے متاعِ حیات نچھاور کرتا ہے اور انھیں اپنے قریب سے قریب تر کر لیتا ہے۔

ارتقائی طور پر جتنا ہم آگے بڑھیں گے اتنا ہی اس کے قریب ہوں گے، اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہم زندگی کی اعلیٰ ترین منزلیں طے کر رہے ہیں، جسم و ذہن کے لحاظ سے انسانیت کا ارتقا اس کے ظہور کی پیش بندی ہے۔ عصرِ حاضر کے لیے اس کی ذات ایک آئیڈیل ہے۔ لیکن ارتقائے انسانیت ایک آئیڈیل نسل کے ظہور یا کم و بیش منفرد صلاحیتوں کے حامل چند افراد کے ظہور کی طرف بڑھ رہی ہے جنہیں اس کے موزوں ترین والدین ہونے کا شرف حاصل ہوگا۔ لہٰذا روئے ارضی پر خلافت الٰہیہ کا مفہوم کم و بیش منفرد افراد کی جمہوریت ہوگا جس کی صدارت روئے زمین پر منفرد ترین ممکنہ صلاحیتوں کا حامل انسان کامل کرے گا۔ نطشے نے بھی اس آئیڈیل نسل کے تصور کی ایک جھلک دیکھی تھی لیکن اس کا یہ تصور اس کے الحادی اور اشراقی نقصانات کی نذر ہو گیا‘‘۔

میرا خیال ہے کہ ہر قاری اس امر سے اتفاق کرے گا کہ اسرار خودی کے مفاہیم اتنے موثر ہیں کہ ہر کسی کی توجہ کا مرکز بنیں گے۔ نظم میں بظاہر یہ فلسفہ مختلف انداز یا پہلو سے سامنے آتا ہے۔ فکر و اظہار کی بے باکی شوخ نہیں تاہم مصنف کی منطقیانہ ذہانت، جذبات اور تصورات کی جگمگاہٹ سے ہم آہنگ ہے۔ لہٰذا دماغ پر تسلط جمانے سے قبل وہ قلب انسانی کو موہ لیتی ہے۔ نظم کا فنی پہلو بھی گراں قدر اہمیت کا حامل ہے اور خاص کر جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان بھی شاعر کی مادری زبان نہیں (تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے)۔ میں نے اس کے انداز کو جہاں تک بامحاورہ نثری ترجمے میں ممکن تھا برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اصل نظم کے کئی بند ایسے ہیں جو ایک بار پڑھنے کے بعد آسانی سے بھلائے نہیں جا سکتے۔ مثلاً انسان کامل، جو دنیا کا نجات دہندہ ہوگا کی صفات اور اس کی دعائیں جو اختتام کتاب میں مندرج ہیں (خاص کر قابل ذکر ہیں)۔ جلال الدین رومی کی طرح اقبال بھی حکایات و روایات کا بڑا رسیا ہے کیونکہ اس طرح وہ منطقی دلائل سے کنارہ کشی کرتے ہوئے اپنے مطالب کی نشاندہی اور وضاحت زیادہ مؤثر طریقے سے کرتا ہے جو بصورت دیگر ممکن نہیں۔

اسرار خودی جب پہلی بار شائع ہوئی تو اس نے نوجوان ہندی مسلمانوں میں ایک طوفان برپا کر دیا اور ان میں سے ایک نے لکھا کہ ’’اقبال ہمارے درمیان وہ مسیح بن کر آیا ہے جس نے مردوں کو حیات نو کا پیغام دیا ہے‘‘ تاہم یہ ابھی دیکھنا ہوگا کہ حیات نو کے حامل کون سا رخ اختیار کرتے ہیں۔ کیا وہ بیت اللہ کے

شاندار مگر سریع الفہم تصور سے ہی مطمئن ہو جاتے ہیں یا وہ مصنف کے مجوزہ جدید اصولوں اور اس کے برعکس حسب منشا بدلنا چاہیں گے کیونکہ وہ تو واضح طور پر نیشنلزم کی تردید کرتا ہے مگر اس کے مداح بضد ہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کا یہ مفہوم نہیں۔

اس کی فکر کا اثر انجام کار کہاں تک کارگر ہوگا، میں پیش گوئی نہیں کرتا، تاہم اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ''شاعر امروز وفردا'' ہے۔ وہ عصر حاضر سے اختلاف بھی کرتا ہے۔ ہم اس کے نظریات کو اس کے ہم مذہب بھائیوں کے کسی فرقے کے لیے مخصوص قرار نہیں دے سکتے۔ وہ مسلم ذہن میں بنیادی تبدیلی کا پیش خیمہ ہیں اور ان کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ کسی مقررہ مدت تک اپنا اثر دکھا سکیں گے یا نہیں۔